ڈاکٹر اسلم فرخی

مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۲۵

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے
(مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں
تبدیل کیا جاتا ہے، ہمارے کتابی سلسلے
کا حصہ بننے کیلئے **وٹس ایپ** پر رابطہ
کریں

حسنین سیالوی

0305-6406067

ڈاکٹر اسلم فرخی

مکتبہ پیام تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

Bachchon Ke Mirza Ghalib
by
Dr.Aslam Farrukhi
Rs. 10/-

تقسیم کار

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025 فون نمبر: 011-26987295

Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۔ 6 فون نمبر: 011-23260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۔ 3 فون نمبر: 022-23774857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۔ 2 فون نمبر: 0571-2706142

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ فون نمبر: 011-26987295

فروری ۲۰۱۱ء تعداد: 1000 قیمت: -/10 روپے

سود آفسیٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲ میں طبع ہوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولوی صاحب گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے تھے۔ کمرے میں سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ سامنے حقہ رکھا ہوا تھا۔ ایک کاغذ دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے جاتے اور بگڑتے جاتے۔ سامنے ایک نو عمر لڑکا بیٹھا تھا۔ دس گیارہ برس کا ہوگا مگر قد کا ٹھ کے اعتبار سے اپنی عمر سے بہت بڑا معلوم ہوتا تھا۔ مضبوط ہاتھ پانو۔ لمبا قد۔ اکہرا گا بڑا جسم۔ سر بھی بڑا۔ سر بڑا سردار کا۔ چوڑے شانے۔ چہرے پہ کچھ غصہ کچھ کھسیاہٹ۔ چپ چاپ مولوی صاحب کی ڈانٹ سُن تھا۔ مولوی صاحب کہہ رہے تھے "دو میاں مرزا نوشہ۔ باپ تمھارے۔ فوجی سردار۔ چچا تمھارے قلعہ دار۔ نانا کمیدان۔ برچھی بھالے کے چلانے والے۔ تم بھی انھیں کے ہنر سیکھتے، تم سے کس نے کہہ دیا کہ شاعری کی ٹانگ توڑو اور وہ بھی فارسی میں۔ اردو وردو میں کچھ کہہ لیتے۔ فارسی میں دوڑ پڑے۔ کہنا ہی ہے تو اردو میں کہا کرو۔ میاں یہ دونوں لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوتے جن میں تم نے گھسیٹ دیے ہیں۔ فارسی تمھارے بس کی نہیں۔"

مرزا نوشہ جن کا نام اسد اللہ تھا کان دبائے مولوی صاحب

کی ڈانٹ سنا کیے۔ وہ یہ سمجھ کر اپنی غزل مولوی صاحب کے پاس لائے تھے کہ مولوی صاحب خوش ہوں گے ہمت بندھائیں گے مگر وہی مثل ہوئی کہ "گئے تھے روزے بخشوانے۔ الٹی نماز گلے پڑ گئی۔" روٹھے ہوکر گھر لوٹ آئے۔

مرزا نوشہ لڑکے تھے۔ دس گیارہ برس کی عمر ہوگی مگر اس کم عمر میں دو بڑے صدمے برداشت کرچکے تھے۔ ان کے بزرگ ترکستان سے برّصغیر آئے تھے۔ پہلے لاہور میں رہے۔ پھر دلّی آگئے وہاں سے آگرے آ بسے۔ اُن کے باپ مرزا عبداللّٰہ بیگ، فوجی سردار تھے۔ لکھنؤ میں نوکری کرتے رہے۔ پھر حیدرآباد دکن میں نوکر رہے۔ وہاں سے گھر آگئے۔ آگرے کے قریب ہی ایک ریاست تھی الور۔ وہاں چلے گئے۔ الور کے راجا نے انھیں ایک باغی سردار کے مقابلے پر بھیجا۔ وہاں ان کے گولی لگی۔ مرگئے۔ مرزا نوشہ اس وقت پانچ برس کے تھے۔ پانچ برس کے بچّے کی بساط ہی کیا ہوتی ہے مگر باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جائے تو پانچ برس کے بچّے کو بھی احساس ہوتا ہے اور اس کی دنیا میں تبدیلی آجاتی ہے۔ مرزا کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک کمی کا احساس ضرور ہوا ہوگا۔

مرزا عبداللّٰہ بیگ کے ایک بھائی تھے مرزا نصراللّٰہ بیگ۔ وہ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے قلعہ دار تھے۔ آگرے پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا تو مرزا نصراللّٰہ بیگ انگریزی ملازمت کرنے لگے۔ کچھ جاگیر بھی مل گئی۔ انھوں نے مرزا نوشہ اور ان کے چھوٹے بھائی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ بیٹوں کی طرح پرورش کرنے لگے۔ ان کے خود کوئی اولاد نہیں تھی۔ چار برس اس طرح گزرے۔ مرزا نو برس کے ہوگئے۔

ایک دن مرزا نصر اللہ بیگ ہاتھی پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ ہاتھی نے ٹھوکر کھائی۔ مرزا نصر اللہ بیگ گر پڑے۔ بہت چوٹ آئی۔ اسی حادثے میں مر گئے۔ بچارے مرزا نوشہ ایک بار پھر یتیم ہو گئے باپ کا سایہ سر سے پہلے ہی اٹھ چکا تھا۔ اب چچا کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے۔ مرزا نصر اللہ بیگ کے مرتے ہی انگریزوں نے ان کی جاگیر واپس لے لی۔ ہاں یہ کیا کہ ان کے گھر والوں کی تنخواہ مقرر کر دی۔ اس تنخواہ میں مرزا کا حصّہ بھی تھا۔

چچا کے مرنے کے بعد مرزا نوشہ کے نانا مرزا غلام حسین کمیدان نے اُن کی پرورش کی۔ نانا بھی رئیس تھے مرزا نوشہ یہاں بھی آرام سے رہے۔ پڑھتے رہے۔ اُن کے محلّے گلاب خانے میں بڑے بڑے عالم۔ اُستاد اور شاعر رہتے تھے بڑے پڑھے لکھے لوگوں کا محلّہ تھا۔ سب اشراف رہتے تھے۔ دن رات لکھنے پڑھنے اور علم کا چرچا رہتا۔ مرزا پڑھتے لکھتے بھی تھے اور کھیلتے کودتے بھی تھے۔ خوب چوسر کھیلتے۔ کنکوّے اڑاتے۔ کچھ شعر بھی کہنے لگے تھے دوستوں نے کہا تو پتنگ پر ایک چھوٹی سی نظم لکھ دی۔ فارسی شاعروں کے دیوان پڑھتے رہتے تھے۔ فارسی میں بھی غزل لکھّی۔ لکھ کر مولوی صاحب کو دکھانے لے گئے مگر وہ سنتے ہی پہ سے اُکھڑ گئے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے۔

مولوی صاحب کی ڈانٹ سے مرزا نوشہ کو رنج ہوا۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔ چُپکے ہو رہے۔ تین چار دن کے بعد فارسی کے ایک بڑے شاعر کا دیوان پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے کیا دیکھا کہ اس شاعر نے بھی وہی دونوں لفظ اُنھیں معنوں میں استعمال کیے ہیں جن معنوں میں خود مرزا نے استعمال کیے تھے۔ اب کیا تھا

کتاب بغل میں دبائی۔ خوش خوش مولوی صاحب کے پاس پہنچے، کتاب سامنے رکھ دی۔ مولوی صاحب نے اُن لفظوں کو دیکھا تو بھوں چکّے رہ گئے بڑا تعجب ہوا۔ کہنے لگے " مرزا نوشہ یہ خدا داد بات ہے۔ تمھیں فارسی زبان سے خدا داد نسبت ہے۔ جیسے جی چاہے لکھو۔ جس طرح جی چاہے لکھو کسی کے کہنے کی پروا نہ کرو۔ چاہے میں کہوں چاہے کوئی اور۔ کمال ہے تمھارا ذہن بھی وہیں پہنچا جہاں اتنے بڑے شاعر کا دماغ گیا۔ بھئی واہ یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے "۔ مولوی صاحب کی یہ باتیں سن کر مرزا نوشہ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ساری جھجک جاتی رہی۔

آگرے میں مرزا اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل کود اور تفریح میں وقت گزارتے رہے۔ شعر کہتے رہے۔ شاعری میں اُن کا دل خوب لگتا تھا مگر عام انداز کی شاعری نہیں۔ اُنھیں عام شاعروں کی طرح شعر کہنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سب سے الگ بالکل نئے انداز کے شعر کہتے تھے۔ نہایت مشکل۔ خیال بھی مشکل۔ لفظ بھی مشکل۔ کہنے کا انداز بھی مشکل۔ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔

میر تقی میر اردو کے بڑے مشہور شاعر تھے۔ مرزا نوشہ کی طرح وہ بھی آگرے کے رہنے والے تھے۔ پھر دلّی چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ جا بسے۔ اس زمانے میں بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ کسی نے نو عمر مرزا نوشہ کے کچھ شعر اُنھیں سنائے۔ کہا۔ اکبر آباد کا یہ لڑکا عجیب انداز کے شعر کہہ رہا ہے۔ نہ پہلے کسی نے کہے۔ نہ اِن دنوں کوئی اور کہتا ہے۔ معلوم نہیں کیا کہنا چاہتا ہے۔ میر صاحب نے شعر سُن کر کہا "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اسے سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر ہوگا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔

میر صاحب کو اردو شاعری میں خدائے سخن کہا جاتا ہے انھوں نے

نوعمر مرزا نوشہ کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف سچا ثابت ہوا۔ مرزا نے مہمل بھی بکا اور جب سیدھے رستے پر پڑ گئے تو لاجواب شاعر ہوئے۔

لڑکا چاہے کتنا چھوٹا ہو۔ ماں کو اس کا سہرا دیکھنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ ویسے بھی اب سے ڈیڑھ دو سو برس پہلے لڑکے لڑکیوں کی شادیاں چھوٹی عمر میں کر دی جاتی تھیں۔ مرزا نوشہ پورے تیرہ برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کی شادی ہوگئی۔ بیوی کوئی گیارہ برس کی ہوں گی۔ امراؤ بیگم نام تھا۔ دلی کے ایک رئیس نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں۔ معروف شاعر بھی تھے۔ رئیس بھی تھے اور مزاج کے اعتبار سے درویش تھے۔ ان کے بڑے بھائی نواب احمد بخش خاں فیروز پور جھرکے اور لوہارو کے نواب تھے بڑے نامی گرامی آدمی تھے۔

شادی کے بعد مرزا نوشہ کا دلی آنا جانا بڑھ گیا اور پھر وہ اسی شہر کے ہوگئے۔ آگرہ چھوڑ دیا۔ دلی میں مکان لے لیا۔ دلی والے ہوگئے۔ شعر و شاعری زور و شور سے ہوتی رہی۔

دلی میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ یہاں بے شمار شاعر تھے۔ بادشاہ سے لے کر عام آدمی تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ تھے وہ بھی شاعر تھے۔ ان کے ولی عہد مرزا ابو ظفر بھی جو بعد میں بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ظفر کہلائے، بہت اچھے شاعر تھے۔ سارا شہر شاعروں سے بھرا ہوا تھا، شاعر بھی تھے۔ عالم بھی تھے، ہر فن کے آدمی موجود تھے۔ مرزا نوشہ رئیس زادے۔ شاعر۔ ملنسار۔ آن بان والے۔ دلی کے نوجوانوں میں پہچانے جانے لگے مگر انھیں دلی کی عام شاعری پسند نہیں آئی۔ وہ آگرے میں بھی مشکل شعر کہتے تھے۔ دلی میں بھی

اُسی انداز کے شعر کہتے رہے بلکہ اب تو اتنے مشکل شعر کہنے لگے تھے جنھیں عام سننے والے سمجھ نہیں پاتے تھے۔

مرزا نوشہ سے کوئی سو برس پہلے فارسی کے ایک شاعر گزرے تھے۔ وہ بھی مرزا تھے۔ برصغیر کے ایک مشہور شہر عظیم آباد کے رہنے والے تھے (اب اس شہر کو پٹنہ کہتے ہیں) ان شاعر کا نام مرزا عبدالقادر تھا۔ بیدل تخلص تھا۔ دلّی میں بھی رہے تھے۔ ایک مغل شہزادے کے دربار میں ملازم تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدل فارسی کے بڑے مشکل شاعر تھے۔ بڑے زبردست شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی قدر برصغیر سے بہت زیادہ افغانستان میں ہوئی۔ وہاں ان کا کلام بڑے شاندار طریقے سے شائع ہوا ہے اور انھیں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مرزا نوشہ کو مرزا بیدل کے شعروں سے بڑی دلچسپی تھی بہت پسند کرتے تھے۔ وہ اردو میں انھیں کے انداز کی غزلیں لکھتے تھے ان کے رنگ میں شعر کہنے کو قیامت سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک شعر میں یہ بات کہی بھی ہے ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا   اسد اللہ خاں قیامت ہے

ریختہ یعنی اردو زبان۔ اُس زمانے میں اردو زبان کو ریختہ کہتے تھے مگر مرزا اُنتّیس برس کی عمر تک یہ قیامت کرتے رہے۔ بڑے اطمینان سے بیدل کے رنگ میں شعر کہتے رہے۔ خوب غزلیں لکھیں۔ اتنی لکھیں کہ پورا ایک دیوان جمع ہوگیا۔ اس دیوان میں بہترین شعر بھی ہیں اور بہت معمولی بھی۔ ایک بہت بڑے ذہن کا کمال بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے اور بھٹکنے کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ لیکن مرزا نوشہ بڑے ہوشیار آدمی تھے انھوں نے اپنا یہ دیوان شائع نہیں ہونے دیا۔ اس دیوان سے تھوڑی سی غزلیں چُن لیں اور باقی کلام کو شائع

نہیں کیا۔ بعد میں لوگوں نے یہ دیوان ڈھونڈ نکالا اور پورے کا پورا شائع کر دیا۔ اسے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ کی فکر کیسی بلند اور نظر کتنی تیز تھی۔

مرزا سے پہلے کے اردو شاعر اپنی شاعری میں وہ سب بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے جو ان کے دل پر گزرتی تھی۔ رنج۔ تکلیف۔ پریشانیاں۔ زندگی کے دکھ۔ مجبوریاں۔ ناکامیاں۔ یہ انداز دلّی کے شاعروں کا تھا لکھنؤ کے شاعروں نے خوبصورتی کے ظاہری پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ سارے شاعر زبان۔ محاورے اور لفظوں کو سلیقے سے استعمال کرنے پر بڑا زور دیتے تھے۔ بعض اوقات شعر میں خیال کے بجائے زبان ہی زبان رہ جاتی تھی۔ محاورہ اچھا بندھ جاتا تھا مگر شعر بہت معمولی ہو جاتا تھا۔

مرزا نوشہ کا طریقہ اس سے بالکل الگ تھا۔ جو کچھ دل پر گزرتی تھی اُس کے بارے میں سوچتے اور غور کرتے تھے۔ ایسا کیوں ہے۔ ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ سوچتے تھے اور جو کچھ سمجھ میں آتا تھا۔ جس نتیجے پر پہنچتے تھے اُسے شعر میں بیان کرتے تھے۔ یہ انداز عام طریقے سے بالکل الگ تھلگ تھا۔ اس وجہ سے عام پڑھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ اسے فضول اور مہمل سمجھتے تھے۔ لوگ نئے انداز کو آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ عام طور پر اس کا مذاق اڑاتے ہیں مگر جب آہستہ آہستہ وہ انداز اپنا سکّہ جما لیتا ہے تو پھر سب اُسے مان لیتے ہیں۔

زبان اور محاورے کی بات یہ ہے کہ زبان ایک زندہ چیز ہے زندہ چیزوں میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ زبان میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ نئے نئے لفظ آتے رہتے ہیں۔ پُرانے لفظ نئے آنے والوں کے

لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ جب ٹی وی عام ہوا تو اس کے ساتھ انگریزی کا مشکل لفظ این ٹنا بھی عام ہوگیا۔ بڑی بوڑھیاں اور بچّے سبھی یہ مشکل لفظ بولنے لگے۔ کیسٹ کا لفظ عام ہوگیا ہے۔ گراموفون کا لفظ بچّے نہیں سمجھتے حالانکہ اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے گراموفون گھر گھر ہوتے تھے۔ اب سے سو برس پہلے انگرکھے پہنے جاتے تھے۔ مرزا نوشہ بھی انگرکھا پہنتے تھے۔ اب انگرکھے کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ لفظ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ یہی حال محاوروں اور مثلوں کا ہے۔ آج زور وشور سے استعمال ہیں ہیں۔ کل استعمال بالکل بند ہو جائے گا۔ سیکڑوں محاورے اور مثلیں ایسی ہیں جنھیں ہم بھول گئے اور بھولتے جا رہے ہیں۔ جن شعروں میں محاورے اور مثلیں ہوتی ہیں وہ ایک خاص مدّت تک زندہ رہتے ہیں۔ پھر اُن کے معنی سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے آہستہ آہستہ ان کا اثر بالکل ختم ہوجاتا ہے۔

مرزا نوشہ نوجوان تھے مگر اللّٰہ تعالیٰ نے انھیں بڑا روشن ذہن دیا تھا۔ انھیں یہ اندازہ ہوگیا کہ آنے والے دور میں زبان کا انداز بدل جائے گا۔ محاوروں اور مثلوں کی شاعری زیادہ با اثر نہیں رہے گی۔ ایسی زبان استعمال کرنا چاہیے جو ہر دور میں زندہ رہے وہ زبان نکھو جو آج کے دور اور آنے والے دور میں سمجھی جائے اور اس میں پُرانا پَن نہ پیدا ہو۔ اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ شعر کی بنیاد زبان کے بجائے خیال پر رکھی جائے۔ نوجوان مرزا نوشہ نے اپنی شاعری میں یہی طریقہ اختیار کیا۔ محاوروں اور مثلوں کو چھوڑا اور خیال کو نئے انداز کی زبان میں پیش کیا۔ اس نئے انداز میں فارسی کا اثر بہت زیادہ تھا۔ مرزا کو یقین تھا کہ آگے چل کر اردو زبان پر فارسی کا اثر اور گہرا ہوگا۔ اس وجہ سے فارسی سے فائدہ

اٹھانا چاہیے۔ اُنھیں ویسے بھی فارسی سے بہت دل چسپی تھی۔

اب دو مشکلیں جمع ہوگئیں۔ ایک تو یہ کہ مرزا پر عبد القادر بیدلؔ کا بہت اثر تھا۔ انھیں کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ اردو والوں کے لیے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔ دوسرے زبان۔ محاوروں اور مثلوں پر شعر کی بنیاد رکھنے کے بجائے ایک نئے انداز کی زبان لکھ رہے تھے۔ خیال بھی مشکل اور زبان بھی مشکل۔ بندھے ٹکے انداز سے شعر کہنے والے مرزا کے شعروں کا مذاق اڑاتے تھے۔ کہتے تھے ان میں معنی نہیں ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی شاعری ہے ایک شعر بھی مشہور ہوگیا تھا ؎

زبانِ میر سمجھے یا کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مرزا ان اعتراضوں کو سُنتے تھے مگر کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ صرف ایک دفعہ یہ کہا کہ میرا کلام مشکل ہے۔ لوگ مجھ سے آسان کہنے کی فرمایش کرتے ہیں مگر میرے لیے کہنا اور نہ کہنا دونوں مشکل ہیں۔ عام شاعروں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ آگے چل کر اردو شاعری کا انداز بالکل بدل جائے گا اور مرزا کا انداز اردو شاعری کا صحیح انداز بن جائے گا

مرزا دلّی میں بے فکری کے دن گزار رہے تھے۔ رئیس زادے تھے۔ رئیسوں میں رہتے تھے مگر آمدنی لگی بندھی تھی۔ آمدنی کیا تھی وہی تنخواہ تھی جو انگریزوں سے ملتی تھی۔ بعض اوقات تکلیف بھی ہوتی تھی۔ دل کھول کر خرچ نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں یہ خیال ہوا کہ جو تنخواہ ملتی ہے وہ کم بھی ہے اور ان کے چچا کے مرنے کے بعد تنخواہ کی جو تقسیم ہوئی تھی وہ بھی غلط ہے۔ ان کی تنخواہ زیادہ ہونا چاہیے۔ یہ سوچ کر مرزا نے کلکتے جانے کی ٹھانی۔ جہاں انگریزوں کا سب سے بڑا افسر رہتا تھا سوچا کہ اسی کے یہاں عرضی دیں۔ فیصلہ ہو جائے گا اور تکلیف ختم ہو جائے گی

مرزا گھومتے پھرتے کلکتے پہنچے۔ کانپور گئے۔ وہاں بیمار ہو گئے پھر لکھنؤ گئے۔ وہ بھی شاہی شہر تھا۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ لکھنؤ سے باندے گئے وہاں سے کلکتے پہنچے۔ تنخواہ کے لیے عرضی دی مگر کچھ ہوا نہیں۔ جو امید تھی کہ تنخواہ بڑھ جائے گی۔ تنخواہ بڑھنے سے روپیا ملے گا وہ ختم ہو گئی۔ کلکتے جانے کا خرچ علیحدہ۔ قرض دار بھی ہو گئے اور کوئی کام بھی نہ ہوا۔

کلکتے جانے کا جو مقصد تھا وہ پورا نہیں ہوا۔ سفر کی پریشانیاں، خرچ۔ ناامیدی۔ سب اپنی جگہ مگر مرزا کو ایک بہت بڑا فائدہ بھی ہوا کلکتہ انگریزوں اور ان کی حکومت کا مرکز تھا۔ یہاں جوان مرزا نوشہ کو زندگی کا ایک نیا انداز دیکھنے کا موقع ملا۔ انھوں نے بھاپ سے چلنے والے جہاز دیکھے۔ بے شمار نئی چیزیں دیکھیں۔ نئے قاعدے قانون دیکھے۔ نئے خیالات معلوم ہوئے۔ کلکتہ دلّی کے مقابلے میں ایک بالکل نئی دنیا تھا جہاں کی ہر چیز نئی اور انوکھی تھی۔ شاعری کی زبان کو نیا انداز دینے والے مرزا کو یہ نئی دنیا آنے والے دور کی صحیح تصویر معلوم ہوئی۔ انھیں اندازہ ہو گیا کہ جلد ہی پرانے خیالات اور پرانی تہذیب کی اس نئی دنیا کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کے لیے اس نئی دنیا کو قبول کر لینا چاہیے۔ مشکل یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ نئی چیزوں اور نئے خیالات کو آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ آگے نہیں بڑھ پاتے۔ مرزا ایسے لوگوں میں نہیں تھے۔ ان کا ذہن روشن تھا۔ نئے انداز کو پسند کرتے تھے۔ اپنے زمانے سے بہت آگے تھے۔ یہی ان کا بڑاپن تھا۔

اپنے زمانے سے آگے ہونے والوں کو قدم قدم پر مشکلوں کا

سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کلکتے میں مرزا کو یہ مشکل پیش آئی کہ وہاں فارسی کے جو شاعر تھے۔ انھوں نے مرزا کی فارسی شاعری پر اعتراض کیے مرزا نے ترکی بترکی جواب دیا۔ وہی لکیر کے فقیر ہونے والی بات تھی۔ پرانے اور نئے ذہن کی ٹکر تھی۔ سب کے سب ہاتھ دھو کر مرزا کے پیچھے پڑ گئے۔ کچھ انصاف پسند لوگ بھی تھے۔ انھوں نے مرزا کا ساتھ دیا مگر نئے ذہن اور پرانے ذہن کی ٹکر کا اثر مرزا کی پوری زندگی پر رہا۔

اب پھر وہی دلّی۔ مرزا کوئی پونے تین برس دلّی سے باہر رہے تھے۔ پھر وہی زندگی شروع ہوگئی۔ وہی شعر و شاعری۔ وہی روپے کی تنگی۔ ہاں ایک فرق یہ ہوا کہ مرزا کے ایک بڑے گاڑھے دوست تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی بہت بڑے عالم تھے۔ سارے ملک میں ان کی لیاقت اور علم کا شہرا تھا۔ انھوں نے بعض اور دوستوں کے ساتھ مل کر مرزا کو سمجھایا کہ مشکل شعر نہ کہو۔ آسان کہو۔ مشکل شعر کم لوگ سمجھتے ہیں۔ تمھارا انداز سب سے الگ ہے۔ الگ پہچانا جاتا ہے۔ اب اسے آسان بناؤ۔ ان دوستوں نے یہ بھی کہا کہ مرزا نے جو بڑا دیوان جمع کر لیا تھا۔ اس میں کانٹ چھانٹ کی اور بہت سا کلام نکال دیا۔ اب جو مرزا کا دیوان عام طور پر ملتا ہے وہ ان کے سارے کلام کا تھوڑا سا حصّہ ہے۔

مرزا پر اس سمجھانے کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے آسان شعر کہنے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ ان کی شاعری پہلے جیسی مشکل نہیں رہی۔ میر صاحب نے ان کا کلام سن کر جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہوا۔ مرزا بھٹکے بھی خوب اور پھر خود ہی اپنے استاد بھی ہوگئے۔ دوستوں کے مشورے سے اپنے کلام کی اصلاح کر ڈالی۔ یہ اُن کے

بڑے پن کی بات تھی۔ ورنہ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ شاعر یا نثر لکھنے والے نے جو کچھ لکھ دیا وہ پتھر کی لکیر ہوگیا، اب کوئی لاکھ سمجھائے۔ مشورے دے، مگر مانتا کون ہے "جو لکھ دیا" سو لکھ دیا۔ مرزا کا بڑاپن یہ تھا کہ وہ صحیح بات کو حیل حجّت کے بغیر مان لیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اپنے ایک فارسی قصیدے میں "عید قرباں" کے لفظ لکھے ان کے ایک شاگرد نے قصیدہ سُنا تو کہا "یہاں" عید قرباں" کے بجائے "عید اضحیٰ" کے لفظ زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مرزا نے ان کی بات کو پسند کیا اور عید قرباں کے بجائے "عید اضحیٰ" کے لفظ لکھ دیے۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ہرگز نہ مانتا مگر مرزا عام آدمی نہیں تھے۔

پُرانی پریشانیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔ قرض کا بوجھ الگ آمدنی بہت کم۔ کیا کریں۔ خود دار آدمی کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا اُس زمانے میں دلّی میں ایک بڑا مشہور کالج تھا۔ دلّی کالج۔ اس میں فارسی کے پروفیسر کی جگہ نکلی۔ کالج والوں سے کسی نے کہا "اس وقت شہر میں مرزا غالب (مرزا اب اپنے تخلص سے مشہور ہوگئے تھے)۔ حکیم مومن خاں مومن اور مولا صہبائیؔ فارسی کے بڑے عالم ہیں انھیں میں سے کسی کو رکھ لینا چاہیے" سب سے پہلے مرزا بلائے گئے۔ ان کا بڑا نام تھا۔ رئیس تھے۔ ایک بڑے انگریز افسر نے بلایا۔ مرزا اپنے زمانے کے دستور کے مطابق پالکی میں گئے۔ اب مرزا اپنی پالکی میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ صاحب استقبال کے لیے آئیں تو وہ اتر کر اندر جائیں (جب مرزا رئیس کی حیثیت سے دربار میں جاتے تھے تو انگریز افسر ان کے استقبال کے لیے پالکی تک آتے تھے) مگر اس دفعہ یہ ہوا کہ افسر نہ اب آتا ہے نہ جب آتا ہے۔ بڑی دیر ہوگئی۔ آخر وہ افسر آیا اور کہنے

لگا، "ویل مرزا صاحب! اس وقت آپ دربار میں نہیں آئے ہیں۔ نوکری کے لیے آئے ہیں۔ دربار میں آئیں گے تو ہم آپ کا استقبال کریں گے نوکری کے لیے آنے والے کا استقبال نہیں ہوتا۔" مرزا نے کہا۔ "اگر نوکری سے عزت نہ بڑھے۔ رہی سہی عزت بھی ختم ہوجائے تو ایسی نوکری کو سلام ہے۔" صاحب نے کہا، "ہم اپنے قاعدے سے مجبور ہیں۔" مرزا نے کہا، "میں بھی اپنے قاعدے سے مجبور ہوں۔" یہ کہہ کر واپس آگئے پریشان اور ضرورت مند تھے مگر اپنی آن میں بٹہ نہ لگنے دیا۔ ضرورت پڑے تو بڑے بڑے تیس مار خاں بھی اپنی مونچھیں نیچی کرلیتے ہیں مگر مرزا خود دار آدمی تھے۔ جس بات سے عزت میں ٹھیس لگے اُسے گوارا نہیں کرتے تھے۔

اب مرزا پر ایک اور اُفتاد پڑی، یار دوست اُن کے گھر پر جمع ہوتے تھے۔ چوسر کھیلی جاتی تھی۔ شرط بھی ہوتی تھی کھیلنے والے دائو بھی لگاتے، شرط کرنا۔ دائو لگانا بالکل غلط اور جُرم مگر کسی کو پروا نہیں تھی۔ سب مزے سے کھیلتے رہتے جب تک مرزا کے ایک دوست مرزا خانی شہر کے کوتوال رہے کوئی کھٹکا نہیں ہوا مگر مرزا خانی چلے گئے۔ نیا کوتوال آگیا۔ اس نے ایک شام چھاپا مارا۔ مرزا اور ان کے دوست پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا۔ مرزا کو چھے مہینے کی سزا ہوگئی۔ دوستوں نے لاکھ زور لگایا۔ بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھے۔ انھوں نے سفارش کی مگر کوئی سنوائی نہیں ہوئی۔ مرزا جیل بھیج دیے گئے۔ تین مہینے جیل میں رہے پھر سول سرجن نے سفارش کی تو رہائی ملی۔ مرزا کو اس واقعے سے بڑا صدمہ ہوا۔ ہونا بھی چاہیے تھا۔ رئیس تھے۔ بڑے آدمی سمجھے جاتے تھے۔ شہر میں بڑا نام تھا۔ کہاں سب لوگ تعریف کرتے تھے کہاں انگلیاں اُٹھنے لگیں، "ارے بھئی یہی ہیں مرزا غالب۔ انھیں کو

قید ہوئی تھی،، دلّی کے شاعر ویسے ہی مرزا سے جلتے تھے۔ خار کھاتے تھے۔ انھیں ایسا موقع خدا دے۔ بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتی۔ مگر مرزا چُپ رہنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ چُپ ہی رہے۔ اندر ہی اندر گھٹتے رہے۔ جیل میں انھوں نے اپنے حال کے بارے میں فارسی کی ایک نظم لکھی۔ بڑے کمال کی نظم ہے۔ پڑھ کر بڑا اثر ہوتا ہے۔

مرزا کی پریشانیاں بڑھتی گئیں۔ آخر ان کے ایک دوست حکیم احسن اللہ خاں نے ان کے لیے ایک صورت نکالی۔ احسن اللہ خاں بہادر شاہ کے وزیر اعظم تھے۔ تاریخ کے بڑے عالم بھی تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ سے کہا کہ خاندان مغلیہ کی ایک تاریخ لکھوائی جائے یہ بھی کہا کہ ان دنوں مرزا غالب سب سے اچھی فارسی نثر لکھتے ہیں۔ ان سے یہ کام لیا جائے۔ بہادر شاہ نے حکیم احسن اللہ خاں کی رائے مان لی۔ ۴ر جولائی ۱۸۵۰ء کو مرزا دربار میں طلب کیے گئے۔ بہادر شاہ نے انھیں نجم الدولہ۔ دبیر الملک۔ نظام جنگ،، کے خطاب دیے۔ خلعت دیا۔ خاندان مغلیہ کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد ہوا۔ پچاس روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوگئی ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

غالب خاندان مغلیہ کی تاریخ لکھنے لگے۔ دربار دار ہوگئے۔ بعض شہزادے بھی غالب کے شاگرد ہوگئے۔ آمدنی کچھ بڑھی مگر خرچ اس سے زیادہ بڑھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو نجانے کیا حال ہوتا مگر مرزا سدا کے ہنسنے ہنسانے والے آدمی۔ بڑی سے بڑی پریشانی میں بھی ہنستے رہتے تھے۔ خود بھی ہنستے تھے دوسروں کو بھی ہنساتے تھے غضب کے حاضر جواب تھے۔ وقت پر ایسی بات کہتے تھے کہ سب ہنس پڑتے

تھے۔

ایک دن غالب دربار میں حاضر تھے۔ رمضان کے بعد کا دربار تھا بادشاہ سب سے روزوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ مرزا سے بھی پوچھا" مرزا تم نے کتنے روزے رکھے" مرزا نے ہاتھ باندھ کر کہا" پیرو مرشد۔ ایک نہیں رکھا،،

بہادر شاہ شاہی باغ میں ٹہل رہے تھے۔ مرزا بھی ساتھ تھے آموں کی فصل۔ درخت آموں سے لدے ہوئے تھے۔ مرزا کو آم بے حد پسند تھے۔ ہر درخت کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ بہادر شاہ نے پوچھا" مرزا کیا دیکھ رہے ہو،، مرزا نے کہا" حضور بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ دانے دانے پر نام لکھا ہوتا ہے یہ دیکھ رہا ہوں کسی آم پر میرا یا میرے باپ دادا کا نام تو نہیں لکھا ہے۔،، بہادر شاہ ہنس پڑے۔ اُسی دن شاہی باغ کے آم، مرزا کے یہاں پہنچ گئے۔

مرزا کے ایک دوست کو آم بالکل پسند نہیں تھے۔ ایک دن وہ مرزا کے یہاں بیٹھے تھے۔ سامنے سڑک پر آموں کے چھلکے پڑے تھے۔ ایک گدھا اُدھر سے گزرا۔ ٹھہر کر چھلکوں کو سونگھا اور چلا گیا وہ دوست کہنے لگے۔ مرزا صاحب دیکھا آپ نے۔ آم ایسی چیز ہے کہ گدھا بھی نہیں کھاتا،، مرزا نے فوراً کہا۔ ہاں گدھا آم نہیں کھاتا،،

بہت ہنستے رہتے تھے مرزا۔ اسی وجہ سے انھوں نے بڑی سے بڑی تکلیف گوارا کر لی۔ عید کا دربار تھا۔ مرزا نے قصیدہ پڑھا دربار سے نکلے تو سیدھے اپنے دلی دوست اور شاگرد نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے یہاں گئے۔ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ نواب صاحب

نے پوچھا۔ خیر تو ہے مرزا صاحب۔ بولے۔ ہاں خیر ہے۔ آج حضور نے ہماری بڑی قدر دانی کی۔ دربار میں قصیدہ پڑھا تو فرمایا "مرزا تم پڑھتے خوب ہو"۔ مطلب یہ کہ تمھیں شعر وغیرہ تو کہنا آتا نہیں۔ ہاں پڑھتے اچھا ہو۔ کسی شاعر کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہوسکتی ہے کہ آپ اس سے کہہ دیں۔ بھئی آپ شعر تو اچھے نہیں کہتے مگر پڑھتے ضرور اچھی طرح ہیں۔ مرزا اور شیفتہ دونوں بہادر شاہ کی اس بات پر افسوس کرتے رہے۔ مگر یہ افسوس دودھ کا سا ابال تھا پھر وہی زندہ دلی۔ وہی ہنسنا ہنسانا۔

بہادر شاہ کے ایک بیٹے تھے۔ مرزا جواں بخت۔ بڑے چہیتے تھے۔ ان کی والدہ زینت محل کو بہادر شاہ کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ جواں بخت کی شادی ہوئی۔ بڑی دھوم دھام ہوئی۔ زینت محل نے مرزا غالب سے فرمایش کی۔ ایک سہرا لکھ دیجیے۔ مرزا نے خوشی خوشی سہرا لکھا۔ اس کا آخری شعر تھا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

ہنسنے ہنسانے اور تفریح کی بات ہے۔ شاعر کو اس طرح کی بات کہنے کا حق ہوتا ہے مگر جب یہ شعر بہادر شاہ کے سامنے پڑھا گیا تو انھوں نے اسے پسند نہیں کیا۔ انھوں نے کہا "ہم نے شیخ محمد ابراہیم ذوق کو اپنا استاد بنا رکھا ہے تو ہم سخن فہم نہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے رہے۔ ذوق بلائے گئے۔ غالب کا سہرا انھیں دکھایا گیا۔ ذوق نے بھی جواب میں سہرا لکھا اور اس میں یہ شعر بھی لکھا ؎

جن کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنادو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

مرزا بڑے سمجھ دار تھے۔ سمجھ گئے کہ بات بگڑ گئی ہے۔ معذرت کے طور پر ایک نظم لکھی۔ اس میں لکھا ؎

استادِ شہ سے ہو مجھے پُرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جانے کس دل سے لکھا ہوگا۔ رنج تو ہوا ہوگا مگر ہنس بول کر غم غلط کر لیتے تھے۔

بہادر شاہ کے دربار میں یہ دستور تھا کہ تنخواہ ہر مہینے کے بجائے چھے مہینے بعد ملتی تھی مرزا اس دستور سے بہت پریشان ہوئے۔ انھیں روپے کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی قرض سے کام چلاتے تھے۔ سود بہت ادا کرنا پڑتا تھا۔ تہائی تنخواہ سود میں چلی جاتی تھی۔ آخر کار نظم میں عرضی لکھی۔ بڑی دل چسپ اور شوخی سے بھری ہوئی ؎

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض ۔۔۔ اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا ۔۔۔ ہوگیا ہے شریک ساہوکار
میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ ۔۔۔ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

مرزا ضرب المثل والی شاعری کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے لیکن اس نظم کا آخری شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ ان کے بے شمار شعر بڑی سچائیوں کی وجہ سے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔ سچے شعر زبانوں پر چڑھ کر ضرب المثل بن جاتے ہیں۔

بہادر شاہ کے اُستاد شیخ محمد ابراہیم ذوق اللہ کو پیارے ہو گئے تو مرزا بادشاہ کے استاد مقرر ہو گئے۔ تنخواہ سو روپے ہو گئی

گزارا کرتے رہے ہے

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگر نہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

استادِ شاہ اور مصاحب ہونے پر کیا اترانا۔ یہ محض ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہیں۔ استاد بنے تین برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ آزادی کی جنگ شروع ہوگئی۔ برِصغیر کے باشندے انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے مگر انگریز بڑے ہوشیار تھے ان کے پاس فوج بھی اچھی تھی۔ ہتھیار بھی اچھے تھے۔ ادھر ملکی باشندوں میں پھوٹ بھی تھی اور کوئی تنظیم بھی نہیں تھی۔ انگریز جیت گئے بہادر شاہ قید کر لیے گئے۔ بہت سے شہزادے شہید ہوئے۔ انگریزوں نے دلّی شہر کو لوٹ لیا۔ ہزاروں مکان گرا دیے۔ لا تعداد آدمی مار دیے۔ بڑا ظلم ہوا۔

مرزا نے تباہی اور بربادی کے یہ سارے منظر اپنی آنکھ سے دیکھے۔ انگریزوں کا ظلم اور زیادتی بھی دیکھی۔ ذاتی طور پر بھی پریشان رہے۔ ان کے ایک چھوٹے بھائی تھے مرزا یوسف۔ دماغ میں کچھ خرابی تھی وہ محلے کی گلی میں ٹہل رہے تھے۔ انگریز سپاہیوں نے گولی مار دی۔ شہر میں ایسی دہشت تھی کہ نعش کو قبرستان بھی نہ لے جاسکے۔ کفن کے لیے کپڑا بھی نہ ملا۔ گھر سے سفید چادریں لیں ان میں لپیٹا اور گڑھا کھود کر محلّے کی مسجد میں دفن کر دیا۔ مرزا غالب کو کیسا صدمہ ہوا ہوگا مگر کیا کر سکتے تھے۔ ان کے بہت سے دوست احباب ملنے جلنے والے اسی طرح انگریز سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ساری محفلیں اُجڑ گئیں۔ بہت سے دوست احباب جان بچا کر دوسرے شہروں کو نکل گئے۔ مرزا اکیلے رہ گئے۔

حالات ایسے تھے کہ مرزا گھر سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ دروازہ بند کیے بیٹھے رہتے تھے۔ جنگ کے حالات میں ایک کتاب لکھنا شروع کر دی۔ اس زمانے میں فارسی اشراف کی زبان تھی مرزا خود فارسی کے شاعر اور فارسی کے نثر نگار۔ بڑے اہتمام سے کتاب لکھی۔ اہتمام یہ کیا کہ پوری کتاب میں فارسی زبان کے علاوہ کسی اور زبان کا لفظ نہ آئے۔ زبانیں ملی جُلی ہوتی ہیں۔ ہر زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ بھی ہوتے ہیں۔ اردو۔ فارسی۔ عربی انگریزی سب کا یہی حال ہے مگر بعض لکھنے والے اپنا کمال دکھانے کے لیے خالص زبان بھی لکھتے ہیں۔ سیّد انشاؔ اردو کے ایک بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے ایک کہانی لکھی۔ رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی کہانی۔ اس میں صرف ہندی کے لفظ استعمال کیے۔ فارسی عربی کے لفظ نہیں آنے دیے۔ اکبری دربار کے ایک شاعر تھے فیضی۔ انھوں نے عربی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی مگر اہتمام یہ کیا کہ کوئی نقطے دار حرف استعمال نہیں کیا۔ اس اہتمام سے فائدہ کوئی نہیں ہوتا مگر لکھنے والے کا کمال ضرور ظاہر ہوتا ہے۔

مرزا نے جنگ آزادی کے حالات میں چھوٹی سی کتاب اسی اہتمام سے لکھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد چھپی اور مشہور ہوئی۔ ایک کام انھوں نے یہ کیا۔ دوسرا کام یہ کیا کہ فارسی زبان کی ایک بڑی مشہور لغت 'برہان قاطع' ان کے پاس تھی۔ اُسے پڑھتے رہے وہ خود فارسی زبان کے اُستاد تھے۔ برہان میں بہت سی باتیں غلط معلوم ہوئیں۔ کہیں الفاظ کے معنیٰ غلط۔ کہیں معنیٰ لکھنے کا انداز غلط۔ غرض بے شمار غلطیاں نظر آئیں۔ مرزا کتاب کے حاشیے پر سب نوٹ کرتے گئے۔ امن چین ہوگیا تو ان سب کو جمع کر لیا

ایک کتاب بن گئی۔ قاطع برہان، نام رکھا۔ چھپوادی۔ کتاب کیا چھپی کہ جیسے بم پھٹ گیا۔ ہر طرف شور مچ گیا۔ لیجیے صاحب اتنی مشہور لغت میں کیڑے ڈالے ہیں۔ استادوں کے منہ لگتے ہیں۔ ہزار طرح کی باتیں ہوئیں۔ باتیں ہی نہیں ہوئیں۔ لوگوں نے قاطع برہان کے جواب میں کتابیں بھی لکھ ڈالیں۔ اعتراضوں کے جواب دینے کے بجائے فضول باتیں بھی لکھیں۔ مرزا بھی آخر مرزا تھے۔ ٹیڑھے مغل۔ سب کے جواب لکھے۔ کچھ اپنے نام سے لکھے کچھ اپنے شاگردوں کے نام سے۔ مقابلے پر ڈٹے رہے۔ صرف ایک کتاب کا جواب نہیں لکھا کیونکہ اس میں لکھنے والے نے بے ہودہ الفاظ اور گالیاں لکھی تھیں۔ کسی دوست نے مرزا سے پوچھا "ارے بھائی مرزا صاحب! آپ نے فلاں کتاب کا جواب نہیں لکھا"، مرزا نے فوراً کہا "بھائی اگر کوئی گدھا تمھارے لات مار دے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے"۔

ساری بات وہی نئے اور پرانے ذہن والی تھی۔ مرزا کو برہان میں غلطیاں نظر آئیں۔ دوسرے لوگ ان غلطیوں کو غلطیاں ماننے پر تیار نہیں تھے کیونکہ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پرانے لوگ بھی کوئی غلطی کر سکتے ہیں۔

یہ جھگڑے اپنی جگہ۔ ادھر یہ مصیبت کہ دربار ختم۔ دربار کی نوکری ختم۔ انگریزی تنخواہ بند۔ شہزادوں سے جو کچھ مل جاتا تھا وہ بھی بند۔ آمدنی کی کوئی صورت نہیں رہی۔ گھر کے برتن اور سامان بکنے کی نوبت آگئی کسی نے پوچھا "مرزا صاحب گزر کیسے ہو رہی ہے"، کہنے لگے "اور لوگ روٹی کھاتے ہیں۔ میں برتن۔ کپڑے اور بستر کھاتا ہوں"۔ بڑی پریشانی کا زمانہ گزرا۔ پھر نواب رام پور نے انھیں اپنا استاد مقرر کر لیا۔ سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد

انگریزی تنخواہ بھی کھل گئی۔ نواب رام پور تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ بھیجتے رہتے تھے۔ مرزا کو رام پور بھی بلاتے رہتے تھے۔ وہ اُن کے بُلاوے پر ایک آدھ دفعہ رام پور گئے بھی تھے۔

ہنسنے ہنسانے والے مرزا کا آخری زمانہ بڑی تکلیف میں گزرا۔ بیماریوں سے تنگ رہتے تھے۔ کانوں سے سنائی نہیں دیتا تھا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلتی رہتی تھیں۔ نوجوانی سے شراب پینے کی بُری عادت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ سے مستقل بیمار رہتے تھے مگر بڑا حوصلہ تھا۔ دوستوں کے خطوں کے جواب لکھتے رہتے تھے۔ ایسے دل چسپ اور مزے دار کہ پڑھنے والا گھنٹوں مزے لیتا رہے۔

مرزا نے اردو نثر میں کوئی کتاب نہیں لکھی مگر وہ اردو نثر میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے۔ اُن کے خط اردو نثر کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ شروع شروع میں مرزا عام دستور کے مطابق فارسی میں خط لکھتے تھے۔ بڑے کمال کا خط لکھتے تھے انھوں نے فارسی میں خط لکھنے کے طریقوں پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ "پنج آہنگ" نام تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اردو میں خط لکھنے لگے اور ایسے لکھنے لگے کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔ اُس زمانے میں بڑے لمبے چوڑے القاب آداب لکھے جاتے تھے۔ عبارت مشکل ہوتی تھی۔ مرزا نے یہ ساری باتیں چھوڑ دیں۔ خط نہیں لکھے، باتیں کی ہیں۔ خط پڑھو تو معلوم ہوتا ہے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں اور باتیں بھی ایسی مزے مزے کی ہیں کہ جو بھی سنے جھوم اٹھے۔ آج بھی لوگ مرزا کے خط مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ ان کے اردو خط ان کی زندگی ہی میں جمع کر کے دو کتابیں تیار ہوئی تھیں۔ عود ہندی اور اردوے معلّی۔ بعد میں

ڈھونڈنے سے اور بہت سے خط ملے ان کے مجموعے الگ چھپے۔

مرزا کے اردو خطوں سے جنگ آزادی کے بعد کی دلّی کا صحیح حال معلوم ہوتا ہے۔ شہر کیسے تباہ ہوا۔ لوگ کس طرح مارے گئے شہر چھوڑ کر کس طرح نکل گئے۔ خود مرزا کا کیا حال ہوا۔ وہ اپنے دوست احباب کو کتنا یاد کرتے تھے۔ کیا سوچتے تھے۔ زندگی کس طرح گزارتے تھے۔ اس زمانے میں ملک کا عام حال کیا تھا۔ یہ ساری باتیں سامنے آتی ہیں اور پھر لکھنے کا انداز بالکل انوکھا۔ اپنے اردو خطوں کی وجہ سے مرزا اردو کے بہت بڑے نثر نگار سمجھے جاتے ہیں۔ ان خطوں کے ذریعے سے دوسرے لکھنے والوں کو صاف اور سیدھی نثر لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔

مرزا کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنا لیا تھا۔ بڑی محبت کرتے تھے۔ بیچارے عارف دو بیٹے چھوڑ کر نوجوان مر گئے۔ مرزا کو بڑا رنج ہوا۔ بڑا درد ناک مرثیہ لکھا۔ پھر ان کے دونوں بچوں حسین علی خاں اور باقر علی خاں کو پالا۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ رام پور گئے تو دونوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ بہت چاہتے تھے۔ ان کے پڑھنے کے لیے فارسی اور اردو لفظوں کی ایک چھوٹی سی لغت نظم میں لکھی "قادر نامہ" اس کا نام ہے۔ بڑے آسان شعر لکھے ہیں ؎

غرب پچھم اور پورب شرق ہے ابر بدلی اور بجلی برق ہے
آگ کا آتش اور آذر نام ہے اور انگارے کا اخگر نام ہے
تیغ کی ہندی اگر تلوار ہے فارسی پگڑی کی بھی دستار ہے
نیولا راسو ہے اور طاؤس مور کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

اس لغت میں بچوں کے لیے غزلیں بھی لکھی ہیں۔ یہ بھی مزے دار ہیں ؎

شعر کے پڑھنے سے کچھ حاصل نہیں مانتا لیکن ہمارا دل نہیں
علم ہی سے قدر ہے انسان کی ہے وہی انسان جو جاہل نہیں
کیا کبھیں کھائی ہے حافظ جی کی مار آج ہنستے آپ جو کھِل کھِل نہیں
کس طرح پڑھتے ہو رُک رُک کر سبق
ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

مرزا کے دوست احباب۔ ملنے جلنے والے۔ شاگرد سارے مُلک میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں پر جان چھڑکتے تھے۔ بڑی محبّت سے پیش آتے تھے۔ جنگ آزادی کی وجہ سے اُن کے بہت سے دوست اور شاگرد تتّر بتّر ہو گئے تھے۔ مرزا اُنھیں یاد کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنے تمام ملنے جلنے والوں سے بڑے خلوص کے ساتھ ملتے تھے۔ ان کے دُکھ سے غم گین اور ان کی خوشی سے خوش ہو جاتے تھے۔ کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے ظلم کی وجہ سے مرزا کے بہت سے دوستوں کی حالت بہت اِبتر ہوگئی تھی۔ مرزا انھیں دیکھتے اور دل ہی دل میں کُڑھتے۔ خود ان کا حال بھی خراب تھا مگر دوستوں کی مدد کرتے رہتے تھے۔

ایک دن اُن کے ایک دوست ملنے آئے۔ جنگ آزادی سے پہلے دلّی کے بڑے لوگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس دن جو وہ مرزا سے ملنے آئے تو معمولی چھینٹ کا فرغل (روئی بھرا چوغہ) پہنے ہوئے تھے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ یہ صاحب اچھے سے اچھا اور قیمتی سے قیمتی کپڑا پہنتے تھے۔ اب یہ حالت ہوگئی کہ جاڑے کے موسم میں چھینٹ کا فرغل پہننے پر مجبور ہوئے۔ مرزا نے معمولی چھینٹ کا فرغل پہنے دیکھا تو دل پر چوٹ لگی۔ باتوں باتوں میں اُن دوست

سے پوچھا "بھئی یہ چھینٹ تم نے کہاں سے خریدی۔ بڑی عمدہ ہے" انھوں نے کہا "ابھی خریدی ہے بلکہ یہ فرغل تو آج ہی سِل کر آیا ہے۔ تمھیں پسند ہے تو لے لو"۔ "ہاں جی تو یہی چاہتا ہے کہ یہ فرغل تم سے لے کر فوراً پہن لوں۔ مگر سردی بہت ہے۔ تم گھر کیا پہن کر جاؤ گے" پھر ادھر اُدھر دیکھا۔ کھونٹی پر سے اپنا نیا چوغہ اُتارا۔ اچھے گرم کپڑے کا تھا۔ دوست سے کہا "لو یہ پہن لو۔ فرغل اُتار دو" اِس طرح مرزا نے ہنسی ہنسی میں گرم کپڑے کا عمدہ چوغہ اُنھیں دے دیا۔ اگر چوغہ ویسے دیتے تو دوست کو بڑا ناگوار ہوتا۔ شاید لینے سے انکار ہی کر دیتے۔

مرزا کی باتیں بھی بڑی مزے دار ہوتی تھیں۔ جو سنتا۔ ہنستا اور لطف لیتا۔ ایک دوست ملنے آئے۔ رات کا وقت تھا جب وہ جانے لگے تو مرزا شمع لے کر فرش کے کنارے تک آئے تاکہ وہ روشنی میں اپنا جوتا آسانی سے پہن لیں۔ ان صاحب نے کہا "مرزا صاحب آپ نے ناحق تکلیف کی میں اپنا جوتا ڈھونڈ کر پہن لیتا"۔ مرزا نے جھٹ کہا "میں روشنی لے کر اس لیے آیا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں"۔

ایک شام مرزا لیٹے ہوئے تھے۔ ایک بڑے خاص شاگرد میرمہدی مجروح پاس ہی بیٹھے تھے۔ وہ مرزا کے پیر دبانے لگے۔ مرزا نے کہا "بھئی تم سیّد ہو۔ کیوں مجھے گنہ گار کرتے ہو"۔ وہ بولے "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کے پیسے دے دیجیے گا"۔ مرزا چُپ ہو گئے جب وہ پیر داب چکے تو کہا "لایئے پیسے"۔ مرزا نے پوچھا "کیسے پیسے۔ تم نے میرے پیر دابے۔ میں نے تمھارے پیسے دابے۔ حساب برابر ہو گیا"۔

مرزا رام پور گئے ہوئے تھے۔ نواب کے مہمان تھے نواب کو کسی

کام سے باہر جانا تھا۔ سب لوگ انھیں رخصت کر رہے تھے مرزا بھی موجود تھے۔ نواب نے مرزا سے مل کر کہا۔ خدا حافظ۔ مرزا بولے خدا نے مجھے آپ کے سپرد کیا ہے۔ آپ پھر مجھے اسی کے سپرد کیے دے رہے ہیں۔ سب ہنس پڑے۔ مرزا عام طور پر ایسی ہی دلچسپ باتیں کرتے رہتے تھے۔ بڑے زندہ دل انسان تھے۔

مرزا وضع دار بھی بہت تھے۔ آن پر جان دیتے تھے۔ جنگ آزادی سے پہلے انگریزی حاکموں کے دربار ہوتے تھے۔ مرزا بھی رئیس کی حیثیت سے بلائے جاتے تھے۔ خلعت ملتا تھا۔ دربار کے بعد درباری عملے کے لوگ مبارک باد دینے اور انعام لینے آتے تھے۔ جنگ کے بعد ایک دربار ہوا۔ مرزا بھی بلائے گئے۔ یہ ان کی پریشانی کا دور تھا۔ دربار میں گئے۔ خلعت ملا۔ لوٹ کر آئے تو عملے کے لوگ حسب دستور انعام لینے آ پہنچے۔ مرزا نے واپس آتے ہی خلعت بکنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ عملے کے لوگوں کو بٹھایا گیا۔ جیسے ہی ملازم پیسے لے کر آیا۔ مرزا نے سب کو انعام دے دیا۔ یہ نہیں کیا کہ خالی خولی ٹال دیتے۔ پہلے کی طرح انعام دیا۔ یہ آن کی بات تھی۔

اردو میں مرزا کا ایک چھوٹا سا دیوان ہے۔ بعد میں لوگوں نے ان کا سارا کلام ڈھونڈ کر نکالا اور اسے شائع کر دیا مگر شہرت اسی چھوٹے دیوان کو ہے۔ خطوں کے دو مجموعے عود ہندی اور اردوئے معلیٰ ہیں۔ قادر نامہ ہے۔ فارسی میں کلیات ہے۔ ایک اور مجموعہ سبد چیں ہے۔ نثر میں پنج آہنگ۔ مہر نیم روز۔ دستنبو اور قاطع برہان ہے۔ برصغیر میں فارسی کے بے شمار شاعر گزرے ہیں مگر بڑے شاعر پانچ ہیں۔ امیر خسرو۔ فیضی۔ عبدالقادر بیدل۔ غالب اور اقبال۔ غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ کہا کرتے تھے "میری شاعری دیکھنا

ہے تو میرا فارسی کلام پڑھو،، اردو شاعری کو اس کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے مگر اُن کی شہرت اردو شاعری کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کا انداز بدل دیا۔ ہماری آج کی شاعری پر ان کا اثر بہت گہرا ہے۔

بہت دن بیمار رہنے کے بعد مرزا ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ دلّی میں ان کا مزار بستی حضرت نظام الدین اولیاؒ میں ہے مرزا غالب اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب شاعر اور ادیب تھے کہ اُن کے بارے میں سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ عالموں نے اُن کے کلام کی شرحیں لکھیں۔ اُن کے کلام کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی ہوا ہر سال ان کے بارے میں نئی نئی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے بارے میں انگلستان اور امریکا سے بھی کتابیں شائع ہوئی ہیں ۱۹۶۹ء میں ہندستان اور پاکستان میں ان کی سوسالہ برسی بڑی دھوم دھام سے منائی گئی تھی۔

مرزا کے نام پر بہت سے ادارے اور سوسائٹیاں بھی قائم ہیں دلّی میں دو ادارے ان کے نام پر بنائے گئے ہیں۔ غالب اکیڈمی۔ غالب کے مزار کے پاس ہے اس میں کتب خانہ ہے۔ بہت بڑا ہال ہے جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرا ادارہ ایوانِ غالب ہے۔ یہاں سے غالب کے نام پر ایک رسالہ شائع ہوتا ہے۔ کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بڑا شان دار ادارہ ہے۔ ساری زندگی پریشانیوں میں مبتلا رہنے والا یہ شاعر آج ساری دنیا کی مانی ہوئی شخصیت ہے۔

غالب کے لطیفے

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے، وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی، جس کا دروازہ اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔ اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لُو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینا اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اُس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقیّد رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہوگیا۔ مرزا نے کہا: قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقیّد رہتا ہے، وہ یہی کوٹھری تو ہے"!

●

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی، اہلِ شہر تحفتہً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے۔ باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا، مگر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا نواب مصطفٰے خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا کہ اس میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہئیں جب سب لوگ اپنی اپنی کہہ چکے، تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا تم بھی اپنی رائے بیان کرو۔ مرزا صاحب نے کہا "بھئی، میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہئیں، میٹھا ہو اور بہت ہو" سب حاضرین ہنس پڑے۔

●

ایک دن قبل غروبِ آفتاب کے مرزا صاحب شام کا کھانا کھا رہے تھے اور کھانے میں صرف شامی کباب تھے۔ حالی بھی وہاں موجود تھے اور ان کے سامنے بیٹھے رومال سے مکھیاں جھل رہے تھے۔ مرزا نے کہا: آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں، "میں ان کبابوں میں سے آپ کو کچھ نہ دوں گا"، پھر خود ہی نے یہ حکایت بیان کی کہ "نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر اُن کے مصاحبوں اور عزیزوں اور دوستوں کے لیے ہر قسم کے کھانے چُنے جاتے تھے، مگر خاص اُن کے لیے ہمیشہ ایک چیز تیار ہوتی تھی، وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک روز اُن کے لیے مزعفر پکا تھا، وہی اُن کے سامنے لگایا گیا۔ مصاحبوں میں ایک ڈوم بہت منہ لگا ہوا تھا، جو اُس وقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اُس کو کھانا دینے کے لیے خالی رکابی طلب کی۔ اُس کے آنے میں دیر

ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے اور خالی رکابی بار بار مانگتے تھے وہ مصاحب نواب کے آگے رومال ہلانے لگا اور کہا "حضور! اور رکابی کیا کیجیے گا، اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔" نواب صاحب یہ فقرہ سن کر پھڑک گئے، اور وہی رکابی اس کی طرف سرکا دی۔

●

ایک دفعہ رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تاروں کی ظاہری بے نظمی اور انتشار دیکھ کر بولے "جو کام خود رائی سے کیا جاتا ہے اکثر بے ڈھنگا ہوتا ہے — ستاروں کو تو دیکھو کس ابتری سے بکھرے ہوئے ہیں! نہ تناسب ہے، نہ انتظام ہے، نہ بیل ہے، نہ بوٹا ہے، مگر بادشاہ خودمختار ہے کوئی دم نہیں مار سکتا۔"

●

کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں، اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے، اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں "امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے، تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے، اس کو سمجھاؤ کہ بھائی! تیرے بچے کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔" وہ ہمیشہ تعلقاتِ خانگی کو جداً یا ہزلاً ایک سخت مصیبت بتایا کرتے تھے۔

●

جاڑے کے موسم میں ایک دن توتے کا پنجرہ سامنے رکھا تھا توتا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ مرزا نے دیکھ کر کہا "میاں مٹھو! نہ تمھارے جورو، نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے ہوئے بیٹھے ہو"۔؟

●

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے، اس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا، مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے۔ گھر پر آکر اس کے دیکھنے کے لیے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا: اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا "کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟"

مطبوعات مکتبہ پیام تعلیم

PAYAM-I-TALEEM

JAMIA NAGAR NEW DELHI-110025